دیے کی آنکھ۔ مقبول عامر

مقبول عامر صوبہ سرحد کے خوبصورت لہجے کے غزل گو شاعر تھے۔ان کے متعلق احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

(مقبول عامر پٹھان ہے۔اس کی مادری زبان پشتو ہے اردو بولتے وقت اس کا پشتون لہجہ واضح ہوتا ہے۔(سنا ہے علامہ اقبال بھی پنجابی لہجے میں اردو بولتے تھے) مگر اُس کی شاعری پر غور کیجیے تو وہ نہایت صاف ستھری اردو میں جذبہ وخیال سے آراستہ ایسی رواں دواں خوبصورت شاعری کرتا ہے کہ اس پر رشک آتا ہے، کہیں کہیں تو سراسر اہل زبان معلوم ہوتا ہے، وہ محاورے اور روزمرے کو ایسے سلیقے سے استعمال کرتا ہے کہ اُن کے مفاہیم میں اضافہ ہوتا محسوس ہوتا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ بنوں کا یہ پٹھان شاعر فراق اور یگانہ کے لحن میں شعر کیسے کہہ لیتا ہے جبکہ وہ اپنی انفرادیت پر بھی آنچ نہیں آنے دیتا۔

مقبول عامر کے ہاں جذبے کی شدت نہایت سلاست اور بے ساختگی سے اظہار پاتی ہے۔اس کا یہ جذبہ ذاتی بھی ہے اور اجتماعی بھی کہ وہ محض باطن کا شاعر نہیں ہے۔وہ اپنے گردوپیش سے آنکھیں بند نہیں کرتا۔وہ جس تجربے سے گزرتا ہے اسے اپنے اندر کھپا لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ شعر کہتا ہے تو اس کے ایک ایک لفظ میں روحِ عصر سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔شعور اور وجدان کو جس طرح مقبول عامر نے اپنی شاعری میں یک جان کیا ہے۔اُس کی مثالیں اردو میں کم ہی دستیاب ہوں گی۔ بلاشبہ اُس نے زندہ رہنے والی شاعری کی ہے۔

کتاب کی ابتداء ایک چھوٹی سی نظم سے ہوتی ہے۔

فردِ جرم

فقیہِ شہر بولا بادشاہ سے
بڑا سنگین مجرم ہے یہ آقا!
اسے مصلوب ہی کرنا پڑے گا
کہ اس کی سوچ ہم سے مختلف ہے

ایک شعر

وہ فصلِ گل کی طرح آ تو جائے گا لیکن
مجھے خزاں کی ہوا دور لے گئی ہو گی

غزل

یہی چنار یہی جھیل کا کنارا تھا
یہیں کسی نے میرے ساتھ دن گزارا تھا

نظر میں نقش ہے صبحِ سفر کی ویرانی
بس ایک میں تھا اور اک صبح کا ستارا تھا

مرے خلاف گواہی میں پیش پیش رہا
وہ شخص جس نے مجھے جرم پر ابھارا تھا

خراج دیتا چلا آ رہا ہوں آج تلک
میں ایک روز زمانے سے جنگ ہارا تھا

مجھے خود اپنی نہیں اس کی فکر لاحق ہے
بچھڑنے والا بھی مجھ سا ہی بے سہارا تھا

زمیں کے کام اگر میری دسترس میں نہیں
تو پھر زمیں پہ مجھے کس لیے اتارا تھا

میں جل کے راکھ ہوا جس الاو میں عامر
وہ ابتدا میں سلگتا ہوا شرارہ تھا

غزل

پھر وہی ہم ہیں وہی تیشۂ رسوائی ہے
دودھ کی نہر تو پرویز کے کام آئی ہے

اپنا مسلک ہی نہیں زخم دکھاتے پھرنا
جانتا ہوں کہ ترے پاس مسیحائی ہے

سانحہ پھر کوئی بستی میں ہوا ہے شاید
شام روتی ہوئی جنگل کی طرف آئی ہے

صبح دم دل کے دریچوں میں یہ پہ یہ ہلکی دستک
دیکھ تو بادِ صبا کس کی خبر لائی ہے

کچھ تو ہم مائل گریہ تھے بڑی مدت سے
کچھ تری یاد بڑی دیر کے بعد آئی ہے

دور اڑتے ہیں فضاؤں میں پرندے عامر
میری کشتی کسی ساحل کے قریب آئی ہے

غزل

آنکھوں کے خواب زار کو تاراج کر گئی
پاگل ہوا چلی تو حدوں سے گزر گئی

دو گام تک ہی سبز مناظر تھے اس کے بعد
اک دشتِ بیکراں تھا جہاں تک نظر گئی

پھر شام کی ہوا نے تری بات چھیڑ دی
پھر میرے چار سو تری خوشبو بکھر گئی

پل بھر وہ چشمِ تر سے مجھے دیکھتا رہا
پھر اس کے آنسوؤں سے میری آنکھ بھر گئی

دو سائے اک مینار کے نیچے بہم ہوئے
اور دھوپ کوہسار کے پیچھے اتر گئی

میں دشت میں بھٹکتا رہا اور ہوائے گل
مجھ کو تلاش کرتی ہوئی در بدر گئی

لہجے میں وہ اثر تھا کہ باوصفِ اختلاف
جو بات منہ سے نکلی دِلوں میں اتر گئی

غزل

سلگ رہی ہے فضا سائباں کے ہوتے ہوئے
زمیں پہ اتنے ستم آسماں کے ہوتے ہوئے

کسی بھی گھاٹ نہ اُترا مرا سفینہء دل
ہوا کے رخ پہ کھلے بادباں کے ہوتے ہوئے

کہ جیسے اُس کو فضاؤں سے خاص نسبت ہو
پرندہ اڑتا رہا آشیاں کے ہوتے ہوئے

مہ و نجوم کی جانب نظر اُٹھے کیسے!
اس اپنے رنگ بھرے خاکداں کے ہوتے ہوئے

عجب طرح کا مسافر تھا اپنا عامر بھی
اکیلا چلتا رہا کارواں کے ہوتے ہوئے

زندگی

روزِ آغاز سے آج تک
لاکھوں صدیوں پہ پھیلے ہوئے وقت کو
ذہن میں لائیے
اور پھر آج سے حشر تک
آنے والے زمانوں کی وسعت کا
ادراک کرتے ہوئے سوچئے
آپ کی زندگی!
یا مری زندگی!
وقت کے بیکراں دشت میں
ایک ذرے برابر بھی ہے یا نہیں؟

کیا اسی سانس بھر وقت کا نام ہی زیست ہے
کیا یہی جرم ہے جس کی پاداش میں
روز مرتے ہیں ہم
بیکراں پستیوں میں اترتے ہیں ہم
دوسروں پر ہی کیا
اپنی جانوں پہ بھی ظلم کرتے ہیں ہم

نظم (مسافتِ جاں)

لمبے اور ویراں رستے پر تنہا چلنا
اپنے آپ سے باتیں کرنا
بھولی بسری میٹھی یادیں
تازہ کرنا
تم کو بھی اچھا لگتا ہے؟

نظم (جوئے شیر)

ذرا اے راہرو، اک بات سننا
میں پربت پار کا نادار بندہ
تری بستی کی جانب آ گیا ہوں
کہ اِک نازک بدن شیریں سخن نے
حریری پیراہن مانگا ہے مجھ سے
تجھے کچھ علم ہے ان وادیوں میں
کوئی ریشم کے کیڑے پالتا ہے؟

غزل

زمین خشک، فلک بادلوں سے خالی ہے
اک ایک بوند کا دشتِ نظر سوالی ہے

یہ جنگِ صدق وصفا یادگار ٹھہرے گی
عدو ہے تیغ بکف، میرا ہاتھ خالی ہے

کوئی پڑاؤ نہیں وقت کے تسلسل میں
یہ ماہ سال کی تقسیم تو خیالی ہے

سفر کی دھوپ اڑا لے گئی ہے رنگ تمام
نہ میرے زخم نہ تیرے لبوں پہ لالی ہے

تمہارا حسن ہی یکتا نہیں زمانے میں
خدا گواہ مرا عشق بھی مثالی ہے

منتظر رہنا مری جان بہار آنے تک

رنگ شاخوں سے گلابوں میں اتر جانے تک

ایک تتلی ہے کہ بے چین اڑی پھرتی ہے

تیرے آنگن سے مرے دل کے پری خانے تک

دشتِ بے آب سے پوچھو کہ وہاں کے اشجار

کن مراحل سے گزرتے ہیں نمو پانے تک

ہم تو چپ چاپ چلے آئے بحکمِ حاکم

راستہ روتا رہا شہر سے ویرانے تک

تشنگی اپنے نصیبوں میں لکھی تھی ورنہ

فاصلہ کچھ بھی نہ تھا ہونٹ سے پیمانے تک

چند لمحوں میں سبھی عکس نکھر آئیں گے

دھند کا راج ہے بس دھوپ نکل آنے تک

غزل

یہ عہدِ کرب مرے نقش کو ابھارے گا
زمانہ اس کو مرے نام سے پکارے گا

ازل سے آدم و فطرت میں برسرِ پیکار
خبر نہیں ہے کہ یہ جنگ کون ہارے گا

ہمیں یہ غم ہے نگارِ وطن کہ ہم نہ رہے
تو جانے کون ترا قرضِ غم اتارے گا

ترے وصال سے آباد تھی مری دنیا
ترا فراق مری عاقبت سنوارے گا

مجھے یقین ہے عامر کہ ایک روز خدا
اسی زمیں پہ بہشت بریں اتارے گا

خوشبوؤں کی بارش تھی، چاندنی کا پہرہ تھا

میں بھی اُس شبستاں میں ایک رات ٹھہرا تھا

تو مری مسیحائی جان! کس طرح کرتا

تیری جھیل آنکھوں سے میرا زخم گہرا تھا

میں نے اس زمانے میں تیرے گیت گائے ہیں

تیرا نام لینا بھی جب گناہ ٹھہرا تھا

اس گھڑی نبھایا تھا اس نے وصل کا وعدہ

جب تمام رستوں پر چاندنی کا پہرہ تھا

رنگ یاد ہے اس کا شام کے دھندلکے میں

آنسوؤں سے میں تر چہرہ کس قدر سنہرا تھا

غزل

دل دریا کے پار اک ایسی وادی تھی
جس میں سارے جذبوں کی آزادی تھی

بوٹے قد کی کومل سی شہزادی تھی
جس نے سارے شہر میں دھوم مچادی تھی

آگ بجھا کر بھی کچھ ہاتھ نہیں آیا
اک جھونکے نے ساری راکھ اڑادی تھی

دریا پر پہنچا تو کتنا رویا تھا
وہ جس نے صحرا میں عمر گنوادی تھی

میں اس کے انبوہ میں اکثر کھو جاتا
میرے اندر اک ایسی آبادی تھی

میری چبھتی نظروں نے اک دن عامر
اُس پیکر کو عریانی پہنادی تھی

بادشاہوں کا بادشاہ تھا وہ
ہم فقیروں کی خانقاہ تھا وہ

ظلمتِ شب میں صبح کا تارہ
دشتِ غم میں نشانِ راہ تھا وہ

خوبصورت بھی، خوب سیرت بھی
جھیل میں جیسے عکسِ ماہ تھا وہ

جو اسے سنگسار کرتے رہے
وہ بھی کہتے ہیں بے گناہ تھا وہ

آدمی بھی بلا کا تھا عامر
اور شاعر تو بے پناہ تھا وہ

غزل

دل ونگاہ میں قندیل سی جلادی ہے

سوادِ شب نے مجھے روشنی دکھادی ہے

میں بارشوں میں نہاتا ہوں دھوپ اوڑھتا ہوں

مرا وجود کڑے موسموں کا عادی ہے

اسے کہو کہ ہواؤں سے دوستی کر لے

وہ جس نے شمع سرِ رہگزر جلادی ہے

کنارِ آب کھڑے اک اداس پیکر نے

ندی میں چپکے سے ایک پنکھڑی بہادی ہے

فلک نے بھیج کے صحرا میں ابر کا ٹکڑا

ہم اہلِ دشت کی تشنہ لبی بڑھادی ہے

قفس میں میرے سوا جب کوئی نہیں عامر

تو پھر یہ کس نے جواباً مجھے صدادی ہے

آسماں کی چادر پر جس قدر ستارے ہیں
ہم نے اتنے ہی لمحے جاگ کر گزارے ہیں

رنگ و نور کے پیکر دیکھ کر خیال آئے
حسن نے مری خاطر کتنے روپ دھارے ہیں

تم قیام کے خوگر، ہم سفر کے شیدائی
بستیاں تمہاری ہیں، راستے ہمارے ہیں

جانے پھول کب مہکیں، جانے آگ کب بھڑکے
دل میں نیم وا کلیاں ذہن میں شرارے ہیں

دل کی ڈولتی کشتی کیسے گھاٹ اترے گی
بے کراں سمندر ہے، بے لگام دھارے ہیں

غزل

رچی ہوئی ہے یہ کیسی مہک ہواؤں میں
میں گھل نہ جاؤں کہیں شام کی فضاؤں میں

یہ کس کا عکس مرے آنسوؤں میں لرزاں ہے
یہ کس کا نام ہے شامل مری دعاؤں میں

چراغ و اطلس و کمخواب ہو گئے ہیں بہم
لگے گی آگ کسی دن حرم سراؤں میں

زمانے والوں سے مایوس ہو گیا شاید
وہ شخص گھورتا رہتا ہے اب خلاؤں میں

میں اڑ تو جاؤں فضائے بسیط کی جانب
مگر یہ آہنی زنجیر میرے پاؤں میں

وصال و ہجر کا جھگڑا نہیں ہے میرے لیے
میں جی رہا ہوں محبت کی دھوپ چھاؤں میں

میں اپنے بخت ستارے کے کھوج میں عامر
تمام عمر بھٹکتا رہا خلاؤں میں

صبح کاذب

شب کے عقوبت خانے کا
نگران سپاہی
ہاتھ میں مشعل لیے ہوئے
دھیرے دھیرے
زنداں کے زینے سے
نیچے اتر رہا ہے

منصف سے

ماں تو آخر ماں ہوتی ہے
بچوں کی خاطر روتی ہے
تم اس کی باتوں پہ نہ جاو
میں نے وفا کا جرم کیا ہے
مجھ کو زنجیریں پہناو
اہل وفا کا مان بڑھاو

بے خبری میں
ایسے سانحے ہم پر گزرے ہیں
جیسے خوابیدہ بچوں پر
کمرے کی چھت آن گرے

غزل

کیوں خوابوں کے محل بنائیں کیوں سپنے تعمیر کریں
جو کچھ ہم پر بیت رہی ہے کیوں نہ وہی تحریر کریں

ہم تو دل کی بات کہیں گے چاہے وقت کے آہن گر
سوچوں پر تعزیر لگائیں جذبوں کو زنجیر کریں

دل کے اندر رِسنے والے آنسو کس نے دیکھے ہیں
جو نظروں سے اوجھل ہے اسے دکھ کی کیا تشہیر کریں

بستی کی ساری قندیلیں صبح تلک روشن رکھیں
تیرہ شبی سے لڑنے والے لوگوں کی توقیر کریں

حال اُس نے پوچھا لیکن یہ سوچ کے ہم خاموش رہے
خود تو صدموں سے بوجھل ہیں اُس کو کیوں دلگیر کریں

جس کے سارے رنگ مری آنکھوں کو ازبر ہیں عامر
آ و دل کی دیواروں پر وہ صورت تصویر کریں

غزل

جانے کیا سوچ کے اربابِ نظر لوٹ آئے
ایک دو گام پہ منزل تھی مگر لوٹ آئے

کاش یوں ہو کہ ٹھہری ہوئی شب ڈھل جائے
کاش یوں ہو کہ وہ گم گشتہ سحر لوٹ آئے

راستہ اتنا کھٹن تھا کہ سفیرانِ وفا
گل بکف نکلے تھے اور خاک بسر لوٹ آئے

ایسے تازہ ہوا بھولے ہوئے غم کا احساس
ہم تیری بزم سے روتے ہوئے گھر لوٹ آئے

منصبِ عدل پہ بھی اہلِ ستم فائز تھے
لوگ ہاتھوں میں لیے کاسۂ سر لوٹ آئے

مدتیں ہو گئیں جس کو یہ نگر چھوڑے ہوئے
کل اچانک وہ یہاں کس کو خبر لوٹ آئے

غزل

راحتیں کہاں ہوں گی کونسے نگر جائیں
کیوں تیری آنکھوں کی جھیل میں اتر جائیں

کیوں نہ اک الگ اپنا راستہ تراشیں ہم
کس کا نقش پا ڈھونڈیں کس کی راہ پر جائیں

اس ملول صورت کی تاب کیسے لاؤ گے
یوں نہ ہو کہ پھر آنکھیں آنسوؤں سے بھر جائیں

تیری جنبشِ لب پر انحصار ہے اپنا
تو کہے تو جی لیں ہم تو کہے تو مر جائیں

کون اس زمانے میں سر پہ ہاتھ رکھے گا
کس کے در پہ لے ہم اپنی چشمِ تر جائیں

اہل درد کہتے ہیں وقت ایک مرہم ہے
اپنے زخم بھی شاید ایک روز بھر جائیں

گام گام پر عامر مشعلیں جلائیں گے
آنے والوں کی خاطر روشنی تو کر جائیں

باچا خان

بابا! تم ناراض نہ ہونا

اپنا تو دستور یہی ہے

شہرِ ستم میں جس کے لبوں پر

صدق وصفا کا نام آیا ہے

ہم نے اُسے آزار دیا ہے

اک تم پر موقوف نہیں ہے

تم تاریخ اٹھا کر دیکھو

جس نے بھی شہرِ خواب سرا میں

ذہنوں کو بیدار کیا ہے

جس نے بھی کوفے کی گلیوں میں

حرمت کا پرچار کیا ہے

ہم نے ایسے اہل دل کو

نذرِ طوق و دار کیا ہے

دیدہ و دل کے اندھیاروں میں

دیئے جلانا جرم ہے بابا!

زرتشتوں کے ایوانوں میں

پھول کھلانا جرم ہے بابا!

تم کس دنیا کے باسی تھے
کذت وریا کے عہد میں رہ کر
صدق وصفا کا دم بھرتے تھے
بغض وعداوت کی بستی میں
الفت کی باتیں کرتے تھے

تم پر جو کچھ گزری، لیکن
اہلِ نظر اب جان گئے ہیں
زندانوں میں پلنے والے
اہل وفا کے اٹھ جانے پر
خلقِ خدا روئے نہ روئے
زنداں کی کالی دیواریں
برسوں تک آہیں بھرتی ہیں
زنجیریں ماتم کرتی ہیں

غزل

ہاں کچھ تو مزاج اپنا جنوں خیز بہت ہے
اور کچھ یہ رہِ عشق دل آویز بہت ہے

مرنے کے لیے تیشہء فرہاد ہے کافی
جینے کے لیے حیلہء پرویز بہت ہے

اب کے نہ کوئی قصر نہ ایوان بچے گا
اب کے جو چلی ہے وہ ہوا تیز بہت ہے

آنکھوں میں دیئے، دل میں ستارے ہیں فروزاں
ورنہ یہ شبِ تار غم انگیز بہت ہے

کچھ بزم کے آداب بھی ملحوظ تھے اس کو
اور کچھ وہ مزاجاً بھی کم آمیز بہت ہے

تم رنگ ہو، خوشبو ہو، ذرا دھیان میں رہنا
صحرائے محبت کی ہوا تیز بہت ہے

غزل

میری تعریف کرے یا مجھے بدنام کرے
جس نے جو بات بھی کرنی ہے سرِ عام کرے

زخم پر وقت کا مرہم تو لگا دیتی ہے
اور کیا اس کے سوا گردشِ ایام کرے

محتسب سے میں اکیلا ہی نمٹ سکتا ہوں
جس نے جرم کیا ہے وہ مرے نام کرے

وہ مری سوچ سے خائف ہے تو اس سے کہنا
مجھ میں اڑتے ہوئے طائر کو تہہ دام کرے

کون آئے گا پئے پرسشِ احوال یہاں
کس کی خاطر کوئی تزئینِ در و بام کرے

مجھ کو بھی ہو مری اوقات کا کچھ اندازہ
کوئی تو صورتِ یوسف مجھے نیلام کرے

چرواہا بستی والوں سے کہتا ہے
پربت کے اُس پار بھی کوئی رہتا ہے

جس دریا کے رستے میں دیوار نہ ہو
وہ دریا کس خاموشی سے بہتا ہے

مولا جیسی فطرت ہے اُس بندے کی
دیکھتا ہے سب کچھ لیکن چپ رہتا ہے

غم کی موجیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں
دل کا ساحل دھیرے دھیرے ڈھتا ہے

میری بھیگی آنکھوں میں اس کا پیکر
جھیلوں میں مہتاب کی صورت رہتا ہے

چاند نے کل شب دریا سے سرگوشی کی
ساحل میرے بارے میں کیا کہتا ہے

مرے خدا، مرے دل!

مری سرشت ہے اُس تندخو کی طرح
جو سرکشی میں کناروں سے سر ٹپکتی ہے
جو اس امید پہ ساحل کی سمت بڑھتی ہے
کہ اس حصار کو ڈھا کر کہیں نکل جائے
نئی حدود، نئی منزلوں کو سر کر لے
اور اپنے جسم کی اک ایک بوند ٹپکا کر
پھٹی زمین کے پیاسے لبوں کو تر کر دے
یہ میری راہ میں جتنی کھڑی ہیں دیواریں
یہ جتنے دشت مرے راستے میں حائل ہیں
میں ایک جست میں ان کو پھلانگ سکتا ہوں
مگر یہ عجز کہ اس اختیار کے باوصف
میں اپنا جادہء مسلک بدل نہیں سکتا
ہر ایک مرحلہء غم عبور کر جاؤں
مگر حصارِ وفا سے نکل نہیں سکتا
یہ جسم و جاں کی کشاکش، یہ اضطراب خدا
نہ جانے کیسے چکے گا ترا حساب خدا

رنگ اور نور کی دنیا میں ذرا لے جائے
کوئی تو ہو جو مجھے شہرِ سبا لے جائے

وہ مجھے ڈھونڈنے نکلے تو اُسے کہہ دینا
دھوپ ہے تیز بہت، سر پہ گھٹا لے جائے

یوں تری یاد مجھے ساتھ لیے جاتی ہے
جیسے پھولوں کی مہک بادِ صبا لے جائے

تری محفل کی طرف جائے کہ مقتل کی طرف
ہم تو جائیں گے جدھر راہِ وفا لے جائے

کب سے ویران جزیرے پہ کھڑا ہوں عامر
کوئی موج آئے مجھے ساتھ بہا لے جائے

ایک منزل کے ہمسفر چپ ہیں
چل رہے ہیں بہم مگر چپ ہیں

دل کی دھڑکن بھی گونج اٹھتی ہے
اس طرح گھر کے بام و در چپ ہیں

لوگ تو دیکھنے سے ہیں قاصر
آپ کیوں صاحبِ نظر چپ ہیں

جانے کس سمت اُڑ گئے ہیں طیور
صبح خاموش ہے شجر چپ ہیں

کون روئے ستم کے ماروں کو
خوف طاری ہے نوحہ گر چپ ہیں

میرے احباب، مصلحت اندیش!
واقفِ حال ہیں مگر چپ ہیں

غزل

کب سے گم سم ہیں در و بام اے رات
کوئی مژدہ، کوئی پیغام اے رات

کیا سنائی نہیں دیتا مجھ کو
خلقتِ شہر کا کہرام اے رات

ایک یہ تیرہ نصیبی اپنی!
اُس پہ یہ جادۂ آلام اے رات

جتنے بھی دکھ ہیں مری جھولی میں
سارے لکھے ہیں تیرے نام اے رات

کون آنکھوں میں بسا ہے اب تک
کس نے دیکھا تھا سرِ شام اے رات

یوں دھری ہے مرے آگے دنیا
جس طرح زہر بھرا جام اے رات

کب سے سجدے میں پڑا ہے عامر
کوئی آیت، کوئی الہام اے رات

اپنے ہمزاد سے

میں حیرت کدے میں کھڑا سوچتا ہوں
مجھے کیا طلب ہے،
میں کیا چاہتا ہوں!
کبھی دشت میں جا کے
تپتی ہوئی ریت پر دوڑنا چاہتا ہوں
کبھی موج بن کر
کناروں سے سر پھوڑنا چاہتا ہوں
کبھی شبنمی گھاس پر لیٹ کر
چاندنی اوڑھنا چاہتا ہوں
مجھے کیا طلب ہے
میں کیا چاہتا ہوں!
کہیں یہ مری مضطرب روح کا
بانکپن تو نہیں ہے؟
کہیں دل نئی منزلوں کی طرف
گامزن تو نہیں ہے؟

غزل

مجھے عزیز ہے کوئی بھی نور پارہ ہو
چراغِ شام ہو یا صبح کا ستارا ہو

ہمارے بیچ محبت کی نہر بہتی ہے
میں اک کنارہ ہوں تم دوسرا کنارہ ہو

اُفق میں دور ستارہ گرا تو ایسے لگا
کہ جیسے تم نے مجھے بام سے پکارا ہو

مجھے یقیں ہے کہ یہ بند ٹوٹ سکتا ہے
بس اک اُمڈتا ہوا تند و تیز دھارا ہو

کوئی تو ہو جو مجھے خود سے ماورا کر دے
کوئی تو ہو جو مجھے جان سے بھی پیارا ہو

میں مانتا ہوں اجل سے مفر نہیں عامر
مگر وہ شخص جیسے زندگی نے مارا ہو

غزل

اندھیری رات ہے، رستہ سجھائی دے تو چلیں
کوئی کرن، کوئی جگنو دکھائی دے تو چلیں

رکے ہیں یوں تو سلاسل پڑے ہیں پاؤں میں
زمین بندِ وفا سے رھائی دے تو چلیں

سفر پہ نکلیں مگر سمت کی خبر تو ملے
سرِ فلک کوئی تارا دکھائی دے تو چلیں

دیارِ گل سے تہی دست کس طرح جائیں
کوئی یہاں بھی غم آشنائی دے تو چلیں

ابھی تو سر پہ کڑی دوپہر کا پہرہ ہے
شفق زمین کو رنگِ حنائی دے تو چلیں

کسی طرف سے تو کوئی بلاوا آ جائے
کوئی صدا سرِ محشر سنائی دے تو چلیں

غزل

میری حدِ نظر وہاں تک ہے
روشنی کا سفر جہاں تک ہے

جانتا ہے یہ وقت کا سقراط
زہر کا ذائقہ زباں تک ہے

ہر طرف دھوپ کی عملداری
سائے کا راج سائباں تک ہے

اس سے آگے ہے بیکراں عالم
ساری تنگی حصارِ جاں تک ہے

پیاس، صحرا، سراب، سناٹا
جانے یہ سلسلہ کہاں تک ہے

رنگ جتنے ہیں سب زمیں پر ہیں
اک خلا ہے جو آسماں تک ہے

ذہن و دل کی یہ کشمکش ساری
بس ترے سنگِ آستاں تک ہے

نیلسن منڈیلا

نیلسن! نیلسن!

تیرے زنداں کے روزن سے آتی ہوئی

روشنی کی کرن

کہہ رہی ہے تجھے

بندِ غم سے پرے

جتنی آنکھیں ہیں اور جس قدر ہاتھ ہیں

سب ترے ساتھ ہیں!

سارے اہلِ نظر

سارے اہلِ وفا

دھوپ اور چاندنی

روشنی اور ہوا

نیلگوں آسماں

اُس میں اڑتا ہوا طائرِ خوش نوا

لہلہاتی زمیں

پھول، خوشبو، صبا

سب ترے ہم نفس

سب ترے ہم نوا

ساعتیں بھی تری

گردشیں بھی تری

وقت کی قید میں جتنے دن رات ہیں

سب ترے ساتھ ہیں

رات کی تیرگی کتنی گھمبیر ہو

روشنی کو کوئی روک سکتا نہیں

وہ جو سیلِ رواں
آ رہا ہے یہاں
کوئی جابر اُسے ٹوک سکتا نہیں
بس ذرا دیر ہے آمدِ حشر میں
ختم ہونے کو ہے ظلم کا سلسلہ
ہار جانے کو ہے لشکرِ اہرمن
ٹوٹ جانے کو ہیں تیرے طوق و رسن

نیلسن! نیلسن!
تیرے زنداں کے روزن سے آتی ہوئی
روشنی کی قسم
میرے شعر و سخن
میرے لوح و قلم
کہہ رہے ہیں تجھے
ظلمت و نور کی
اس کڑی جنگ میں
تو اکیلا نہیں
ہم ترے ساتھ ہیں!
ہم ترے ساتھ ہیں!

غزل

کوئی تو عکس ہو ایسا جو معتبر ٹھہرے
کہیں تو جا کے بھٹکتی ہوئی نظر ٹھہرے

کوئی نہ ساتھ چلا، راستہ ہی ایسا تھا
مرے ہی نقشِ قدم میرے ہمسفر ٹھہرے

جو روشنی سے نگاہیں ملا نہیں سکتے
دیارِ شب میں وہی صاحبِ نظر ٹھہرے

زمانہ گزرا ہمیں ماہتاب دیکھے ہوئے
اُسے کہو کہ ذرا دیر بام پر ٹھہرے

کہیں عدو نے کہیں دوستوں نے روک لیا
رہِ وفا کے مسافر نگر نگر ٹھہرے

یہ چاندنی جو بھٹکتی ہے کو بہ کو عامر
خدا کرے کہ کسی رات میرے گھر ٹھہرے

غزل

بلا کی دھوپ تھی ساری فضا دہکتی رہی
مگر وفا کی کلی شاخ پر چٹکتی رہی

بچھڑتے وقت میں اُس کو دلاسہ دیتا رہا
وہ بے زباں تھی مجھے بے بسی سے تکتی رہی

اُسے خبر تھی کی ہم اہلِ دشت پیاسے ہیں
جبھی تو موج کناروں سے سر ٹپکتی رہی

الم نصیب تو رو رو کے سو گئے شاید
مگر ملول ہوا رات بھر سسکتی رہی

دمِ جدائی وہ مریم صلیب کی مانند
مرے گلے سے بڑی دیر تک لٹکتی رہی

میں ایسی راہ پہ نکلا کہ میری خوش بختی
تمام عمر مرے کھوج میں بھٹکتی رہی

دیپ بن کر جلا بجھا ہوں میں
رات بھر جاگتا رہا ہوں میں

لوگ حیرت سے دیکھتے ہیں مجھے
جانے کیا بات کہہ گیا ہوں میں

مجھ سے ہو کر تجھے گزرنا ہے
تیری منزل کا راستہ ہوں میں

غم کی بارش میں گیلی چھت کے تلے
قطرہ قطرہ سلگ رہا ہوں میں

جانے کس دھن میں گھر سے نکلا تھا
بیچ رستے میں کھو گیا ہوں میں

زندگی ایک راز ہے عامر!
اور یہ راز جانتا ہوں میں

ستمگروں سے ہمیں اس قدر ہی کہنا ہے
یہ طوق و دار تو اہل وفا کا گہنا ہے

رگِ گلو میں بہے یا وفا کی راہوں میں
لہو کی جوئے رواں ہے اسے تو بہنا ہے

سکوں انہیں بھی میسر نہ آ سکے کبھی
ستمگروں نے بھی اس حشر گہ میں رہنا ہے

ایک شعر

جب سارا وقت تری فرقت کی آگ میں جلتا ہے
تیرا عامر ٹھنڈی گھاس پہ ننگے پاوں چلتا ہے

غزل

جانے کس وحشت کا سایہ سا مجھ پہ لہراتا ہے
دل بے چارہ دن ڈھلتے ہی ڈوبا ڈوبا جاتا ہے

میرے اندر محرومی کا جنگل سا اُگ آتا ہے
ابر میرے بنجر کھیتوں پر جب بھی مینہ برساتا ہے

تیرے غم کے نشے سے مرے نین نشیلے رہتے ہیں
تیری یاد کا جھونکا میرا سونا من مہکاتا ہے

دنیا والے چاند نکلنے کی جو بھی توجیہ کریں
میں تو کہتا ہوں یہ جاگنے والوں کو بہلاتا ہے

فرطِ غم سے میں اپنی زنجیریں کاٹنے لگتا ہوں
جب دیوار پہ بیٹھا کوئی پنچھی پر پھیلاتا ہے

یہ آواز کا جادو ہے یا ذوقِ سماعت کا افسوں
اب تک تیرا گیت مرے کانوں میں رس ٹپکاتا ہے

دل بہل جائے گا، اس کا مجھے اندازہ ہے
بات یہ ہے کہ مرا زخم ابھی تازہ ہے

جانے کس طرح صبا تیری خبر لائے گی
میرے زنداں میں نہ روزن ہے نہ دروازہ ہے

ہاں ترے جبر کی شہرت بھی بہت تھی لیکن
اب تو بستی میں مرے صبر کا آوازہ ہے

جتنے بھی دکھ تھے مجھے سونپ دیئے ہیں عامر
دینے والے کو مرے ظرف کا اندازہ ہے

باہر سے بنجر ہوں لیکن اندر سے شاداب
شبنم جیسی سوچیں میری، پھولوں جیسے خواب

غزل

رخِ حیات کو رنگ نشاط مل جائے
کبھی جو تو زرہِ التفات مل جائے

میں اس امید پہ صحرا میں آگے بڑھتا ہوں
کہ اگلے موڑ پہ شاید فرات مل جائے

یہ ٹوٹ پھوٹ ہے میرے وجود کا خاصہ
میں مر نہ جاوں جو مجھ کو ثبات مل جائے

میں اپنی ساری بہاریں نثار کردوں گا
دیارِ گل کو خزاں سے نجات مل جائے

میں اپنے حال پہ قانع رہوں خداوندا
جنہیں طلب ہے انہیں کائنات مل جائے

زمبابوے

ہے لوحِ وقت پہ کندہ وہ داستان کہ جب
مسافرانِ شبِ تار مشعلیں لے کر
سحر کی کھوج میں لمبے سفر پہ نکلے تھے
مہیب رات تھی چاروں طرف اندھیرا تھا
ستمگروں نے ہر اک راستے کو گھیرا تھا
کہیں پہ آگ کا دریا۔ کہیں پہ کوہِ الم
مگر جنوں تھا کہاں ہار ماننے والا
رواں دواں ہی رہا لے کے روشنی کا علم
سفر کٹھن تھا مگر آخرش تمام ہوا
زمانے والوں نے دیکھا کہ اہلِ صدق وصفا
ستم کے سارے مراحل عبور کرنے کے بعد
اس اہتمام سے پہنچے وفا کی منزل پر
کہ آفتاب افق کے جلو سے نکلا تھا
فضا میں چاروں طرف رنگ ونور بکھرا تھا
اک ایسا نور کہ یاروں کے مضمحل چہرے
ستارہ سحری کی طرح دمکنے لگے!
دلوں کے زخم گلوں کی طرح مہکنے لگے

غزل

اب اس کے بعد ترا اور کیا ارادہ ہے
کہ میرا صبر ترے جبر سے زیادہ ہے

تو بوئے گل کی طرح اُڑ رہا ہے اور کوئی
تری تلاش میں برسوں سے پا پیادہ ہے

میں جنگ جیت کے تم کو معاف کر دوں گا
تمہاری سوچ سے بڑھ کر یہ دل کشادہ ہے

غریب شہر سمجھتی ہے جس کو یہ دنیا
وہ شخص خواب جزیروں کا شہزادہ ہے

میں سرگراں تھا مگر اتنا مضطرب تو نہ تھا
رگوں میں آگ رواں ہے کہ موجِ بادہ ہے

جدا نہیں مری رنگ زمین سے عامر
یہ اڑتی دھول مرے جسم کا لبادہ ہے

غزل

خزاں کی رت میں بھی نقشِ بہار باقی ہے
کہ ایک پھول سرِ شاخسار باقی ہے

ترے فریب کا جادو ابھی نہیں ٹوٹا
ابھی تو تجھ پہ مرا اعتبار باقی ہے

گھروں کو لوٹ گئے لوگ شام ڈھلتے ہی
بس ایک شخص سرِ رہگزار باقی ہے

ندی سے چاند نے سرگوشیوں میں پوچھ لیا
اب اور کتنی شبِ انتظار باقی ہے

جبینِ سنگ پہ دو نام کس نے لکھے ہیں
یہ کیسا نقش سرِ کوہسار باقی ہے

وہ قافلہ تو کبھی کا چلا گیا ہے مگر
نظر کے سامنے اب تک غبار باقی ہے

میں مر گیا ہوں وفا کے محاذ پر عامر
پسِ شکست بھی میرا وقار باقی ہے

جواز

ملائکِ خیر و شر سے کہنا
کہ میری جتنی بھی نیکیاں ہیں
انہیں وہ دریا کی نذر کر دیں
کہ میں نے جو بھی بھلائی کی ہے
کسی صلے یا جزا کی امید پر نہیں کی
مگر جہاں تک مری خطاوں کا ہے تعلق
میں ان سے منکر کبھی نہ ہوں گا
حساب کا دن جب آئے گا تو
میں ان کا اقرار خود کروں گا
کہ میرے پاس اپنی ہر خطا کا
جواز بھی ہے!
جواب بھی ہے!

ملاح کا گیت

مدھر سروں میں گیت سناؤ
دل کی بات زباں پر لاؤ
لہروں کا انداز اپناؤ

دریا فطرت میں جوگی ہے
دریا کے من میں موتی ہے
اس جوگی سے میل بڑھاؤ
لہروں کا انداز اپناؤ

پیار ہے دھرتی، پیار گگن ہے
پیار ہی مایہ، پیار ہی من ہے
پیار کا روشن رکھنا الاؤ
لہروں کا انداز اپناؤ

شاخ پہ پنچھی بول رہا ہے
کانوں میں رس گھول رہا ہے
دل یوں ڈولے جیسے ناؤ
لہروں کا انداز اپناؤ

لہروں میں ہلچل سی مچی ہے
پانی میں اک آگ لگی ہے
تم بھی من میں جوت جگاؤ
لہروں کا انداز اپناؤ

اُسے بلاؤ کہ جس کے چہرے پہ چاند تارے سجے ہوئے ہیں
کہ اپنی دھرتی کے آسمان پر سیاہ بادل تنے ہوئے ہیں

یہ کس مسافر کے منتظر ہیں کہ میری بستی کے لوگ سارے
ہتھیلیوں پر چراغ لے کر روش روش پر کھڑے ہوئے ہیں

شجر بھی شاید پکار اٹھیں، حجر بھی شاید زبان کھولیں
مگر ہم اہلِ صفا کے ہونٹوں پہ جیسے تالے پڑے ہوئے ہیں

میں کس سے پوچھوں کہ میری بستی کو کون تاراج کر گیا ہے
تمام خلقت بریدہ سر ہے تمام خیمے جلے ہوئے ہیں

ایک شعر

زندگی دوڑ رہی ہے عامر
وقت کی دھول اڑتی جاتی ہے

غزل

زندگی کا مآل۔ تنہائی
حاصلِ ماہ و سال تنہائی

رات بھر میرے ہم رکاب رہے
چاند، صحرا، غزال، تنہائی

تیری اقلیم سے نکل جائے
کس کی اتنی مجال، تنہائی

زندگی پر محیط ہیں دونوں
موسمِ گل برشگال، تنہائی

میں بھی موجود ہوں کہ ناموجود
اے مری بے مثال تنہائی!

بخت والوں کو راس آتے ہیں
عشق، بادِ شمال، تنہائی

وہ نابینا تھا لیکن دیدہ ور تھا
بلادِ علم تھا، بابِ ہنر تھا

اسے معلوم تھی لفظوں کی حرمت
وہ تقدیسِ قلم سے باخبر تھا

وہ اپنے عہد کی تاریک شب میں
افق پر پھیلتا نورِ سحر تھا

اُسے پڑھتے ہوئے میں سوچتا ہوں
یقیناً وہ کوئی فوق البشر تھا

صلیب جبر پر بھی سچ کا حامی!
وہ شاعر کس قدر شوریدہ سر تھا

ہو پوری خواہش پرواز کیسے
تہہ گنبد اڑے شہباز کیسے

ہمارے درمیاں حائل خلا ہے
تجھے پہنچے مری آواز کیسے

سبھی کچھ ہے تمہاری دسترس میں
تمہیں کوئی کرے ناراض کیسے

مقامِ انتہا پر سوچتا ہوں
کیا تھا یہ سفر آغاز کیسے

ترا پیکر بنا ہے خوشبوؤں سے
بنے گا تو مرا ہمراز کیسے

کوئی دیوار صحرا میں نہیں تو
پلٹ آئی مری آواز کیسے

اسے بھی فاش کر دے گا زمانہ
رہے گا زندگانی راز کیسے

غزل

نہ تیری دسترس میں کچھ نہ میرے اختیار میں
کہ ہم سبھی گھرے ہوئے ہیں جبر کے حصار میں

کسی نے جیسے روک لی ہو روز و شب کی گردشیں
ہمارے ساتھ وقت بھی رہا ہے انتظار میں

ہوائے دہر سے اماں ملی ہے کس کو جانِ جاں
تمارا رنگ اُڑ گیا تو ہم ہیں کس شمار میں

وہ جن کے دم سے رنگ و روشنی ہمیں عزیز ہیں
وہ سارے عکس چھپ گئے ہیں وقت کے غبار میں

جواں دلوں کی خواہشیں کچھ اس طرح اجڑ گئیں
کہ جیسے کاٹ دے کوئی ہرے شجر بہار میں

ترے سمندروں کی بھی سنا ہے کوئی حد نہیں
مگر بلا کی وسعتیں ہیں میرے ریگزار میں

غزل

دیکھ تو یہ کیا ہوا
وقت کیوں ٹھہر گیا

گونج اٹھا سکوتِ شب
درد ایسے بول اُٹھا

کیسے کیسے دکھ سہے
کتنا سخت جان تھا

ایسی یخ ہوا چلی
زخم پھر ہرا ہوا

مدتوں سے چپ تھا وہ
بول اٹھا تو رو پڑا

اب وہ ولولے کہاں
وقت تھا گزر گیا

بادلوں کی گود میں
چاند تھک کے سو گیا

ایک جنگجو قبیلے کے شاعر کا گیت

یہ حرب کرب کی فضا
یہ کشت وخوں کا سلسلہ
ہر ایک آنکھ میں چھپی
ہوئی ہے ایک شعلگی
ٹنگے ہوئے ہیں چار سو
کمان، تیغ اور تبر
لگا ہے ہر مکان پر
لہو میں تر بتر علم
مگر مری متاعِ جاں
بس اک چراغ، اک قلم
مرے خدا کو ہے خبر
مری رگوں میں بھی رواں
یہی لہو، یہی اثر
جوان ہوں، دلیر ہوں
پر اس کے باوجود میں
سفیرِ امن وخیر ہوں
مگر یہ میرے اردگرد
شر کی قدر ومنزلت!
مرے خدا میں کیا کروں!
مرے خدا میں کیا کروں!

وہ خود بھی پیاس کے سوکھے نگر میں بستا ہے
جو ابر بن کے مرے دشت پر برستا ہے

چھلک نہ جائے یہ پیمانہ اس کشاکش میں
کہ خون موج میں ہے اور دل شکستہ ہے

نظر اٹھاوں تو منزل کا فاصلہ ہے وہی
پلٹ کے دیکھوں تو پیچھے طویل رستہ ہے

یہ زہر کس نے انڈیلا ہے میری نس نس میں
یہ کون ہے جو مجھے انگ انگ ڈستا ہے

مرا کسی سے تعلق نہیں تو پھر عامر
یہ کس کا درد مری دھڑکنوں میں بستا ہے

غزل

بس ایک دھن تھی اُسی دھن میں شعر کہتے رہے
تمام عمر ترے غم کی رو میں بہتے رہے

گھر آ گئے تو کوئی منتظر نہ تھا ان کا
جو لوگ دربدری کے عذاب سہتے رہے

زمانے والے جسے سوچنے سے خائف تھے
وہ بات اہلِ جنوں محفلوں میں کہتے رہے

میں جتنی دیر ندی کے کنارے بیٹھا رہا
ردائے آب پہ تازہ گلاب بہتے رہے

خود اپنے آپ سے باتوں کے شوق میں عامر
ہم ایک عمر گھنے جنگلوں میں رہتے رہے

فصلِ گل ہے تو بے اثر کیوں ہے
تن برہنہ مرا شجر کیوں ہے

چاند ہے کیوں مرے تعاقب میں
چاندنی میری ہمسفر کیوں ہے

گل پرستی شعار تھا جس کو
اُس بدن پر قبائے زر کیوں ہے

میں کھڑا ہوں ہوا کے رخ پہ تو پھر
وہ مرے غم سے بے خبر کیوں ہے

کون اترے گا ان نشیبوں میں
اتنی گہری تری نظر کیوں ہے

میں ترا دھیان کر کے سوچتا ہوں
زندگی اتنی مختصر کیوں ہے

دھنک

فضا تیز بارش کے بعد
آئینے کی طرح
جھلملانے لگی ہے!
ہوائیں معطر ہیں
اور نور کی ایک چادر
افق تا افق تن گئی ہے
دریچوں کو وا کر کے
باہر تو جھانکو
دلوں میں بسی آرزو
رنگ بن کر
دھلے آسماں پر دھنک بن گئی ہے

دیارِ سبزہ و گل

دیارِ سبزہ و گل ! میری چاہتوں کے نگر
ترے جمال نے بخشا ہے مجھ کو حسنِ نظر

صبا سے رقص کناں تیرے سبز ٹیلوں میں
فلک سے چاند اُترتا ہے تیری جھیلوں پر
دھنک کے رنگ میں ڈوبے ہیں تیرے شام سحر
دیارِ سبزہ و گل ! میری چاہتوں کے نگر

یہ تیری دھوپ کی زرتار روشنی، یہ فضا
گلوں کی باس چراتی یہ عطر بیز ہوا
یہ نغمہ ریز پرندے، یہ کھیتیاں، یہ شجر
دیارِ سبزہ و گل ! میری چاہتوں کے نگر

ہمیشہ تیرے در و بام جگمگائیں گے
تیرے سپوت لہو کے دیئے جلائیں گے
تری جبیں سے ابھرتے رہیں گے شمس و قمر
دیارِ سبزہ و گل ! میری چاہتوں کے نگر

غزل

تجھے باہوں میں بھرنا چاہتا ہوں
پھر اس کے بعد مرنا چاہتا ہوں

صدف پھر موتیوں سے بھر گئے ہیں
تہہِ دریا اترنا چاہتا ہوں

میں ہم آغوش ہو کر چاندنی سے
تجھے محسوس کرنا چاہتا ہوں

جہاں سے لوگ واپس آ گئے ہیں
میں اُس حد سے گزرنا چاہتا ہوں

ذرا بھیگی ہوائیں بھیج دینا
کہ میں پھر سے نکھرنا چاہتا ہوں

میں اپنی زیست کے خاکے میں جاناں
تمہارا رنگ بھرنا چاہتا ہوں

جو گم ہوئے وہ زمانے تلاش کرتا ہوں
میں واپسی کے بہانے تلاش کرتا ہوں

جسے اجاڑ سمجھ کر کسی نے چھوڑ دیا
میں اُس کھنڈر میں خزانے تلاش کرتا ہوں

سدا کریدتا رہتا ہوں اپنی ذات کا ڈھیر
میں خود میں کس کو نجانے تلاش کرتا ہوں

میں اپنے کھوئے ہوئے روپ کے تعاقب میں
گئی رتوں کے ٹھکانے تلاش کرتا ہوں

انہیں یہ وہم مناتا ہوں رتجگے عامر
میں ہوں کہ خواب پرانے تلاش کرتا ہوں

سکوتِ شب سے تکلم کی ابتدا تو کرو
حدیثِ دل تو کہو، ذکرِ آشنا تو کرو

زمانے والا کبھی اہلِ دل سے جیتے ہیں!
شکست ان کا مقدر ہے تم دعا تو کرو

تمہیں میں عکس تمہارا دکھا نہ دوں تو کہو
تم آئینے کی طرح میرا سامنا تو کرو

بجا ہے ترکِ تعلق مگر کبھی نہ کبھی
کسی بہانے سرِ رہگزار ملا تو کرو

خوبصورت آنکھوں کے لیے ایک نظم

تری آنکھیں

بہت گہری

بہت ہی خوبصورت ہیں

اجازت ہو تو میں کچھ دیر

ان میں جھانک کر دیکھوں

کہ مجھ کو چاند کی مانند

جھیلوں میں اترنا

لطف دیتا ہے

نیلا رنگ

اک دن باتوں ہی باتوں میں
اس نے پوچھا
کونسا رنگ تمہیں بھاتا ہے؟
میں نے نیلا رنگ بتا کر؟
اُس سے پوچھا
تم ایسا کیوں پوچھ رہی ہو؟
وہ شرمائی اور کہا بس ایسے ہی
لیکن کچھ دن بعد
وہ میرے گھر آئی تو میں نے دیکھا
وہ سرتاپا
نیلے رنگ میں رنگی ہوئی تھی

پھر اک بار
میں تیرے شہر میں آیا ہوں
لیکن اب کے
تجھ سے ملنا
جان سے جانا لگتا ہے!

پچھلے برس کا وہ منظر
اب تک میری آنکھوں ہے
جب تو مجھ کو رخصت کرنے
دروازے تک آئی تھی
اور تری بھیگی آنکھوں میں
میرا چہرہ لرز رہا تھا

ہجر کے اس بے انت سفر میں
پل دو پل کا میل تو ساجن
وصل نہیں ہے، خود سوزی ہے

غزل

رات بیٹھا تھا مرے پاس خیالوں میں کوئی
انگلیاں پھیر رہا تھا مرے بالوں میں کوئی

دیدۂ تر نے بڑی دیر میں پہچانا اُسے
روپ کھو بیٹھا ہے دو چار ہی سالوں میں کوئی

غمزدہ شب کی گلوگیر ہوا کہتی ہے
یاد کرتا ہے مجھے جاگنے والوں میں کوئی

میں شبِ شہر میں تھا اور ادھر گاؤں میں
جلتی شمعیں لیے پھرتا رہا گالوں میں کوئی

ہم اندھیروں کے مکیں ان کو نظر آ نہ سکے
کس قدر محور ہا اپنے اجالوں میں کوئی

ہجر نے اتنا ستایا ہے کہ جی چاہتا ہے
کاش مل جائے ترے چاہنے والوں میں کوئی

شب کی تلخی شبِ غم سے پوچھو
ہم پہ جو گزری وہ ہم سے پوچھو

منزلیں گردِ سفر میں ڈھونڈو
راستہ نقشِ قدم سے پوچھو

کتنی جاں سوز ہے فن کی تخلیق
صاحبِ لوح و قلم سے پوچھو

ہم نے دامن جو نہیں پھیلایا
اپنے ہی دستِ کرم سے پوچھو

وہ خواب ٹوٹے ہوئے کتنے ماہ و سال ہوئے
جو عمر بھر کے لیے باعث ملال ہوئے

ہوائے شام دریچوں سے یوں گزر آئی
کہ سارے ٹوٹے ہوئے سلسلے بحال ہوئے

تمام عمر جنہیں مجھ سے اختلاف رہا
تمہارے باب میں وہ میرے ہم خیال ہوئے

اکیلے ہم ہی نہیں ہیں شکستہ پا جاناں!
رہِ وفا میں کئی لوگ پائمال ہوئے

محبتوں کا سفر بھی عجیب تھا عامر
کہ لوگ چلتے رہے، راستے نڈھال ہوئے

ایک نوجوان محنت کش کا نغمہ

دن بھر کی محنت سے تھک کر
شام کو جب گھر جاتا ہوں
افسردہ دہلیز کو اپنا رستہ
تکتا پاتا ہوں
اپنی تھکن کی میلی چادر
آنگن کی رسی پہ ڈال کے
پھر باہر آ جاتا ہوں
رات گئے تک بازاروں میں
اپنا جی بہلاتا ہوں
چمپا کے ہاروں سے
اپنی دنیا کو مہکاتا ہوں
آوارہ کہلاتا ہوں

۔ ÷÷÷÷÷

غزل

اس ایک ذات سے اپنا عجیب ناتا ہے
میں جب بھٹکتا ہوں وہ راستہ دکھاتا ہے

سوادِ شب میں بھی روشن ہے راستہ میرا
وہ چاند بن کے مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے

یہ سوز وساز، یہ تابندگی، یہ ہالہء جاں
کوئی چراغ کی صورت مجھے جلاتا ہے

میں کھو بھی جاوں اگر زندگی کے میلے میں
وہ مہربان مجھے پھر سے ڈھونڈ لاتا ہے

فقیہِ شہر کو معلوم ہی نہیں عامر!
وہ راستہ جو دلوں سے گزر کے جاتا ہے

غزل

آنکھ میں رنگ بھریں، روح کو تازہ کر لیں
شہر سے دور کسی بن میں بسیرا کر لیں

ایسا کھلتا ہوں موسم ہے کہ جی چاہتا ہے
ہم بھی کلیوں کی طرح بند قبا وا کر لیں

بادلوں سے کوئی کہہ دے کہ گھڑی بھر کے لیے
دھوپ میں جلتے ہوئے دشت پہ سایہ کر لیں

دور سے اپنی زمیں کیسے نظر آتی ہے
آؤ کہسار سے وادی کا نظارہ کر لیں

سوچتے رہنے سے بہتر ہے کہ اُٹھ کر عامر
نہر میں بہتے ہوئے پھول کا پیچھا کر لیں

ملازمت

مجھے اس بات کا دکھ ہے
کہ میرا ذہن
میرا وقت
اور میری توانائی
حصولِ رزق کی خاطر
بہت ہی چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر
صرف ہوتے ہیں

قطعہ

یہیں نہیں کہ وہ گم گشتہ قافلہ نہ ملا
پلٹنا چاہا تو پھر گھر کا راستہ نہ ملا

پھر اُس کے بعد سرِ دشت ایسی خاک اڑی
میں دور دور گیا تیرا نقشِ پا نہ ملا

وفا کے شہر سے گزری ہوں آندھیاں جیسے
کسی منڈیر پہ جلتا ہوا دیا نہ ملا

غزل

پاس جو کچھ تھا وار آیا ہوں
بوجھ سر سے اتار آیا ہوں

چھا گیا ہوں تمام رستوں پر
مثلِ موجِ غبار آیا ہوں

پھر اٹھائے ہیں خلق نے پتھر
پھر سرِ رہگزار آیا ہوں

کب رہائی ملے گی بارِ خدا
کتنی صدیاں گزار آیا ہوں

گھر، گھروندے دکھائی دیتے ہیں
میں سرِ کوہسار آیا ہوں

کوئی آیا نہ ساتھ دینے کو
شہر بھر کو پکار آیا ہوں

غزل

زندگی کس ڈگر پہ چلتی ہے
نت نئے راستے بدلتی ہے

تشنگی بجھ رہی ہے کھیتوں کی
برف کہسار پر پگھلتی ہے

میرا چہرہ جھلس گیا کیسے!
آگ تو میرے دل میں جلتی ہے

دھیرے دھیرے اُبھر رہا ہے چاند
روشنی پاؤں پاؤں چلتی ہے